قرآن مجید اور اس کی حفاظت

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ

(۹)

از جناب مولانا محمد بدرعالم صاحب میرٹھی استاذ حدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل

احرف ستہ کے نسخ کی بحث

اب رہا احرف ستہ کے منسوخ ہونے یا نہ ہونے کا مسئلہ تو اس میں شیخ کا خیال یہ تھا کہ جو کچھ عرضہ اخیرہ میں تھا وہ سب مصحفِ عثمانی میں موجود رکھا گیا ہے اس کے سوا بقیہ سب منسوخ ہے۔ یہ تحقیق ابن جریر کے مختار سے ذرا مغائر ہے وہ معین کر کے چھ حروف کا نسخ فرماتے ہیں اور شیخ تعیین نہیں فرماتے بلکہ صرف اجمالاً یہ کہتے تھے کہ جو کچھ عرضہ اخیرہ[1] میں تھا خواہ وہ ایک حرف ہو یا زیادہ وہ سب باقی ہے اور اس کے سوا منسوخ ہے۔

حافظ ابن حجرؒ اسی مسئلہ زیر بحث پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں "جس قرأۃ پر حضرت عثمانؓ نے صحابہ کو جمع فرمایا تھا وہ آخری دور کے موافق تھی۔ [2]

حاکم سے باسناد حسن مروی ہے۔

عرض القرآن علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم — نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے متعدد بار قرآن کا دور

---

[1] نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال جبرئیل علیہ السلام سے قرآن کریم کا دور فرمایا کرتے تھے سنہ رحلت میں جو دور آپ نے فرمایا ہے اس کو عرضہ اخیرہ کہا جاتا ہے۔ اس آخری عرضہ میں ایک یا ایک سے زیادہ احرف جو بھی آ گئے وہ سب مصحفِ عثمانی میں درج کر دیئے گئے تھے اور جن احرف کی قرأت اس دور میں نہیں ہوئی وہ مصحفِ عثمانی میں بھی نہیں رکھے گئے۔ یہ ایک نہایت معتدل اور احسن فیصلہ ہے جس کے بعد ثبوت نسخ کی ذمہ داری بڑی حد تک ختم ہو جاتی ہے۔ [2] فتح الباری ج ۹ ص ۳

علیہ وسلم عرضات ویقولون ان قراءتنا کیا گیا ہے۔ صحابہ کرام فرماتے ہیں کہ ہماری قرأۃ
ھذہ العرضۃ الاخیرۃ آخری دور والی تھی۔

اسی طرح جب ابن عباسؓ سے دریافت کیا گیا کہ آخری قرارت کونسی تھی تو جواب یہی دیا گیا کہ زید بن ثابت کی[1]
بعض روایات سے یہ بھی ثابت ہے کہ آخری قرارت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی تھی۔ حافظ ابن حجرؒ اس کا جواب
یہ تحریر فرماتے ہیں۔

ویمکن الجمع بین القولین بان تکون ہر دو قول میں اس طرح جمع ہو سکتا ہے کہ دونوں
العرضتان الاخیرتان بالحرفین دور کو آخر دو حرفوں کے اعتبار سے کہا جائے لہذا
فیصح اطلاق الاخریۃ علی کل منہما۔ اب دونوں کو آخر کہنا صحیح ہو جائے گا۔

اب اگر یہ سوال کیا جائے کہ مختار ابن جریر کے موافق اگر احرف ستہ منسوخ ہو کر صرف ایک حرف باقی
رہ گیا تھا تو پھر قرارت سبعہ میں باہمی اختلاف کی وجہ کیا ہے تو اس کا جواب امام قرطبی نے حسب ذیل تحریر فرمایا ہے[2]

قرارت سبعہ میں کلمات کی زیادتی و نقصان کے اختلاف کی وجہ نسخ عثمانیہ کا اختلاف ہے۔ کیونکہ
حضرت عثمانؓ نے جب مختلف بلاد میں مصاحف ارسال فرمائے تھے تو بعض نسخوں میں کچھ زیادات بھی تحریر
فرما دی تھیں جو دوسرے نسخ میں نہ تھیں۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ بات معلوم ہو جائے کہ ان آیات کی قرارت
ان زیادات کے ساتھ بھی درست ہے اور اس کے بغیر بھی صحیح ہے۔ اب جس جگہ جو مصحف پہنچا اسی کے مطابق
اس جگہ کی قرارت مشہور ہو گئی۔ جہاں مصحف میں زیادت تھی اس جگہ کے قرا نے اس زیادت کو اپنا مختار بنایا
اور جہاں یہ زیادت نہ تھی ان اطراف کے قرا نے اس کے بغیر قرارت کی۔

ابن جزری کے بیان سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے چنانچہ انھوں نے مصحف مکی اور مصحف شامی
میں جو ایسے اختلافات تھے ان کو بتفصیل تحریر فرمایا ہے۔

---

[1] غالباً جمع قرآن کی خدمت ان کے سپرد کئے جانے کی جہاں اور وجوہ تھیں منجملہ ان کے یہ بھی ہوگی۔ [2] مقدمہ تفسیر ص ۴۶۔

حافظ ابن حجرؒ[1] ابن ابی ہاشم (متوفی ۹۰ھ سے) ناقل ہیں کہ اختلافِ قرارت کی وجہ دراصل یہ ہوئی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف صحابہ جب اطرافِ عالم میں پھیلے تو جہاں جو صحابی پہنچا اس جگہ کے لوگوں نے اُسی کی قرارت اختیار کرلی لیکن جب دورِ عثمانی آیا اور صرف مصاحفِ عثمانیہ کے مطابق قرآن پڑھنا لازم کردیا گیا تو اس امرِ واجب الامتثال کی بنا پر رسم مصحف کے خلاف جو جو قرآرت تھیں وہ سب متروک ہوگئیں۔[2]

مگر چونکہ اس دور کے رسم کتابت میں نقاط اور اعراب ہوتے نہ تھے اس لئے جو اختلافات اس جہت سے تھے وہ بدستور باقی رہے۔ مثلاً جہاں تعلمون بالتاء پڑھا جاتا تھا وہاں بالتاء پڑھا جاتا رہا اور جہاں بالیاء پڑھا جاتا تھا وہاں اسی طرح جاری رہا اور اس طرح مختلف بلاد میں مختلف صحابہ کی قرارت جہاں تک رسم مصحف ان کو متحمل تھا بدستور جاری رہیں۔

ہمارے اس بیان کا یہ مطلب نہ سمجھنا چاہئے کہ رسم مصحف عثمانی کے اختلاف یا گنجائش کے نتیجہ میں قرأ کا یہ اختلاف پیدا ہوا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو قرارت کہ قبل از مصحف جاری تھیں اب ان میں سے صرف اسی قدر باقی رہ گئیں جتنا کہ ان میں سے رسم مصحف کے مطابق تھیں۔ یہی امام قرطبی کی مراد ہے جیسا کہ ابن ابی ہاشم کے تفصیلی بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔ ہاں صرف وہ قرارت جو کہ مصاحف کے رسم کتابت کے برخلاف تھیں وہ ترک کردی گئیں۔

حافظ ابن عمار سے نقل فرماتے ہیں[3]

واصح ما علیہ الحذاق ان الذی یقرأ	علماء حاذقین کا صحیح تر قول یہ ہے کہ جو قرارت کہ اب
الآن بعض الحروف السبعۃ المأذون	رائج ہیں یہ پورے سات احرف کی قرارت نہیں ہیں

---

[1] فتح الباری ج ۹ ص ۲۵ ——— [2] ہم نے اپنے پہلے مضمون میں کئی جگہ منسوخ کا لفظ استعمال کیا ہے اور اسی طرح تصانیف میں بھی یہ لفظ موجود ہے مگر مناسب ہے کہ اس کی بجائے لفظ متروک استعمال کیا جائے۔ منسوخ سے رفع مشروعیت کا ایہام ہوتا ہے اور لفظ متروک میں بقاء مشروعیت کے باوجود بھر مصلحۃً ترک کی گنجائش بھی رہتی ہے۔ یہ بحث جدا ہے کہ نسخ کا اطلاق کتنے معانی پر ہوسکتا ہے ——— [3] فتح الباری ج ۹ ص ۲۴ و ۲۵۔

فی قراءتھما لا کلھا۔ بلکہ ان میں سے بعض کی ہے جن کی اجازت حضرت عثمانؓ نے صحابہ کو دیدی تھی۔
اس کے بعد اس کا ایک ضابطہ کلیہ تحریر فرماتے ہیں کہ جو قرارت رسم مصحف کے موافق ہو وہ تو صحیح اور معمول بہا ہوگی اور جو قرارت کہ اس کے مخالف ہو وہ سب متروک کہی جائے گی جیسا کہ اِنْ تَبْتَغُوْا فضلاً مِّن رَّبِّکُمْ فی مواسم الحج۔ یا جیسے اذا جاء فتح اللہ والنصر ان ہر دو آیات میں زیر خط کلمات رسم مصحف کے خلاف ہیں لہٰذا دونوں متروک کہی جائیں گی۔ ابن عمار کا یہ بھی خیال ہے کہ بہت سے اس قسم کے کلمات جو صحابہ سے ثابت ہیں ممکن اور بہت ممکن ہے کہ وہ ان سے بطریق شرح و بیان مراد صادر ہوئے ہوں اور قرآن کریم میں بطور تفسیر لکھے گئے ہوں۔ پھر بعد میں یہ گمان ہونے لگا ہو کہ شاید یہ قرآن کا جزء تھے۔ بہر حال جب مصحف عثمانی میں ان کا وجود نہ رہا تو ان کو ترک ہی کر دینا لازم ہے خواہ اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ قراءۃ شاذۃ تھیں یا یہ کہ کلمات قرآنیہ کی تفسیریں تھیں اور اسی لئے مصحف عثمانی میں ان کو نہیں لیا گیا۔ فتح الباری[1] میں اس ضابطہ کی مزید تفصیل یوں مذکور ہے کہ اصل یہ ہے کہ صحت قرارت کے لئے چند امور کی ضرورت ہے۔

(۱) صحیح سند سے منقول ہونا۔

(۲) عربیت کے اعتبار سے صحیح ہونا۔

(۳) رسم مصحف کے موافق ہونا۔

بعض علمار نے چوتھی شرط کا اور اضافہ کیا ہے یعنی یہ کہ اس پر اتفاق بھی ہو۔ مکی بن ابی طالب فرماتے ہیں کہ اتفاق سے مراد قرار مدینہ اور کوفہ کا اتفاق ہے بالخصوص امام نافع اور عاصم کا۔ ہاں کبھی کبھی اتفاق سے اہل حرمین شریفین کا اتفاق بھی مراد لے لیا جاتا ہے۔

امام کواشی فرماتے ہیں کہ صحت قرارت کا مدار اسی ضابطہ پر ہے خواہ اس ضابطہ کے موافق یہ قرارت سبعہ ہوں یا اور ستر ہزار ہوں اور جس قرارت میں ان تینوں میں سے کوئی ایک شرط بھی نہ پائی جائے گی تو اسے شاذ

---

[1] فتح الباری ج ۹ ص ۲۷۔

کہا جائیگا۔ ابوالخیر بن الجزری نے کتاب النشر کے شروع میں اس ضابطہ کو اور مبسوط نقل فرمایا ہے۔

كل قراءة وافقت العربية ولو بوجه	ہر وہ قرارت جو عربیت کے لحاظ سے درست ہو خواہ
ووافقت المصاحف العثمانية	ائمہ نحو میں سے کسی ایک ہی کے قول کے موافق ہو
ولو احتمالاً وصح سندها فهي القراءة	خواہ بطریق احتمال ہی اور اس کی سند بھی صحیح ہو تو وہ
الصحيحة التي لا يجوز ردها ولا يحل	ایسی قرارت ہوگی جس کا رد کرنا حرام ہوگا۔ بلکہ
انكارها بل هي من الاحرف السبعة	وہ ان سبعہ احرف میں شمار ہوگی جس پر کہ
التي نزل بها القرآن ووجب على	قرآن نازل ہوا تھا۔ لوگوں پر اس کا قبول کرنا
الناس قبولها سواء كانت عن الائمة	لازم ہوگا خواہ اس کے بعد وہ ائمہ سبعہ سے
السبعة ام عن العشرة ام عن غيرهم	منقول ہو یا عشرہ سے یا ان کے سوا اور
من الائمة المقبولين ومتى اختل	دوسرے مقبول ائمہ سے مگر جب ان
ركن من هذه الاركان الثلاثة اطلق	تین باتوں میں سے کوئی ایک بات نہ پائی
عليه ضعيفة او شاذة او باطلة سواء	جائیگی تو اس پر ضعیف یا شاذ یا باطل ہونے کا حکم
كانت عن السبعة ام عمن هو اكبر منهم۔	لگا دیا جائیگا خواہ وہ کسی سے بھی منقول ہو۔

ابو شامہ "المرشد الوجیز" میں فرماتے ہیں کہ سبعہ قراء کی قرارت پر کسی کو یہ دھوکا نہ کھانا چاہئے کہ وہ سب کے سب متواتر ہیں بلکہ اصل مدار اسی ضابطہ پر ہے لہٰذا جس قاری کی قرارت بھی اس ضابطہ کے مخالف ہوگی وہ مجمع علیہ سمجھی نہ جائے گی ہاں ان ائمہ سبعہ کی قرارت چونکہ مشہور ہوگئی ہیں اور زیادہ تر مجمع علیہ قرارت ہیں اس لئے دوسرے اماموں کی قرارت پر ان کو ترجیح ہے ورنہ اصل مدار اسی ضابطہ پر ہے۔ ابن الجزری نے اپنے مذکورہ بالا بیان میں سے چند قیود کے فوائد خود بتلائے ہیں۔

وہ فرماتے ہیں کہ ولو بوجہ کے تعمیم سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ صحت قرارت کے لئے یہ ضروری نہیں ہے

کہ جو افصح قول ہو اسی کی موافقت ضروری ہے بلکہ ائمہ نحو میں سے کسی کے قول کے موافق بھی ہو جائے جب بھی کافی ہے خواہ وہ قول افصح شمار ہوتا ہو یا نہ، مگر یہ ضروری ہے کہ فصیح ضرور ہو کیونکہ غیر فصیح ترکیب قرآن میں قابلِ برداشت نہیں ہے۔

اصل یہ ہے کہ ثبوتِ قرآنیہ کا مبنی نقل صحیح اور شیوع و شہرت پر ہے۔ ائمہ نحو کی تصحیح یا تغلیط پر مبنی نہیں چند قرارتیں ایسی ہیں جن کا ائمہ نحو انکار فرماتے ہیں مثلاً بارئکم۔ اور یأمرکم میں سکون پڑھا یا والارحام کا زیر اور لیجزی قوم کا نصب وغیرہ۔ مگر یہ سب ثابت ہیں۔ امام دانی فرماتے ہیں کہ مدار قرأت کا نہ کسی لغت کے کثرت استعمال پر ہے نہ ائمہ نحو کے قواعد کی زیادہ مطابقت پر بلکہ مدار صرف صحت نقل پر ہے۔ لہذا جب کوئی قرارت نقل صحیح سے ثابت ہو جائے تو پھر قیاس عربیت یا استعمال لغت سے یہاں کوئی بحث نہیں رہتی۔

لان القراءۃ سنۃ متبعۃ یلزم قبولہا والمصیر الیہا۔ — کیونکہ قرارت ایک ایسی سنت متبعہ ہے جس کا قبول کرنا لازم ہے۔

سنن سعید بن منصور میں لفظ مذکور زید بن ثابت کی زبان سے منقول ہے امام بیہقی اس کی شرح میں فرماتے ہیں کہ سنت متبعہ کا مطلب یہ ہے کہ جو مصحفِ عثمانی اور قرارت مشہورہ میں ثابت ہو چکا اب اس کی مخالفت کسی حال میں بھی درست نہیں ہونی چاہئے۔ دوسری قرارت جو رسم مصحف کے خلاف اور غیر مشہور ہو لغت کے اعتبار سے درست اور قواعد کے لحاظ سے اظہر کیوں نہ ہو۔

اس کے بعد ابن الجزری لفظ احد المصاحف کی شرح میں لکھتے ہیں کہ مطابقت رسم مصحفِ عثمانی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جمیع مصاحف کے موافق ہو بلکہ اگر کسی ایک مصحف کے مطابق بھی ہو جب بھی کافی ہے مثلاً ابن عامر کی قرارت قالوا اتخذ اللہ ولدا ہے اور وقالوا نہیں ہے یعنی اس میں واو نہیں ہے اسی طرح وبالزبر وبالکتب میں دونوں جگہ زیادت بار کے ساتھ ہے مگر یہ صحیح ہے کیونکہ مصحفِ شامی میں اسی طرح مکتوب ہے اگرچہ اور مصاحف میں نہ ہو۔ یا مثلاً ابن کثیر کی قرارت تجری من تحتہا الانہار ہے (سورۂ براءۃ) ان کی

قرارت میں لفظ من زیادہ ہے اور مصحف مکی میں یہ زیادتی موجود ہے لہذا اب شاذ قراءۃ صرف اس کو کہا جائیگا جو مصحفِ عثمانی میں سے کسی کے رسم کے موافق نہ ہو کیونکہ وہ مجمع علیہ رسم کے خلاف ہو جائیگی۔

ولو احتمالاً کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ وہ قرارت حقیقۃً مکتوب نہ ہو مگر اس کو تقدیراً پڑھا جا سکے جیسا کہ مالک یوم الدین لفظوں کے لحاظ سے یہاں الف نہیں ہے مگر چونکہ صحتِ سند کے لحاظ سے مالک بزیادۃ الالف ثابت ہے لہذا رسمِ مصحف میں گو حقیقۃً نہ سہی مگر تقدیراً اس کی صحت ثابت رہیگی جیسا کہ ملک الملک کا املا بھی مصحف میں بحذف الالف ہی ہے۔

وصح سندھا صحتِ سند سے مطلب یہ ہے کہ اس قرارت کے ناقل ہر دور میں عادلین اور اہلِ حفظ حضرات ہوں اور اس کے باوجود جو اس فن کے ماہر حضرات ہیں ان کے نزدیک مشہور بھی ہو۔ امام مکی فرماتے ہیں کہ قرآنِ کریم میں جو قرارت مروی ہے وہ تین قسم کی ہیں۔ (۱) جس کی قرأت واجب اور اس کا منکر کافر ہو۔ یہ وہ قرارت ہے جس کو ثقات نے نقل کیا ہو اور عربیت اور خطِ مصحف کے مطابق ہو۔

دوسری قسم وہ ہے جو بطور آحاد منقول ہو اور بلحاظ عربیت گو صحیح ہو مگر رسم مصحف کے خلاف ہو یہ قرارت دو وجہ سے درست نہیں اول تو اس لئے کہ قرارت مجمع علیہ کے خلاف ہوئی۔ دوم اس لئے کہ بطور آحاد منقول ہوئی حالانکہ قرآن ہونے کے لئے بطریق تواتر نقل ضروری ہے لہذا اس کا منکر کافر نہ کہا جائیگا البتہ علی الاطلاق اس کا انکار بھی اچھا نہیں ہے۔

تیسری قسم یہ کہ ثقہ شخص سے منقول ہو مگر عربیت کے لحاظ سے صحیح نہ ہو یا اس کو نقل ہی غیر ثقہ شخص نے کیا ہو تو یہ قرارت اگرچہ رسم مصحف کے موافق ہو مگر پھر بھی مقبول نہ ہوگی۔

ابن الجزری نے پہلی قسم کی مثال یہ بیان کی ہے۔ مالک و ملک۔ یخدعون و یخادعون اس جگہ تینوں شرطیں پائی جاتی ہیں۔ دوسری قسم کی مثال حضرت عبداللہ بن مسعود کی قرارت واللذکر والانثیٰ ہے کیونکہ یہ بطریق آحاد منقول ہے اور بلحاظ عربیت بھی صحیح ہے مگر رسم مصحف کے موافق نہیں۔ رہ گئی ان قرارت کی مثال

جن کو غیر ثقہ نے نقل کیا ہے۔ کتب میں بکثرت موجود ہیں یہ سب قرا‌ٔت شاذہ یا ضعیفہ ہیں۔ البتہ وہ قرا‌ٔت جن کو ثقہ نے نقل کیا ہو مگر اس کی صحت کے لئے بلحاظ عربیت کوئی وجہ نہ ہو اس کی مثال قریب قریب معدوم ہے چوتھی قسم ایک اور بھی ہے مگر وہ بھی مردود ہے اور یہ وہ قسم ہے جو بلحاظ عربیت صحیح اور رسمِ مصحف کے موافق ہو مگر کسی طور پر بھی سلف سے منقول نہ ہو۔ اس قسم کو رد کرنا ہی مناسب ہے اور اس کا مرتکب ایک بڑے گناہ کا مرتکب ہے۔

امام ابوعبید فضائل القرآن میں فرماتے ہیں کہ قرا‌ٔت شاذہ کا بڑا مقصد قرا‌ٔت مشہورہ کی تفسیر ہے مثال کے طور پر حضرت عائشہؓ کی قرا‌ٔت الصلوٰۃ الوسطیٰ صلوٰۃ العصر مشہور قرا‌ٔت میں صلوٰۃ العصر کی زیادتی نہیں ہے مگر حضرت عائشہؓ کی قرا‌ٔت گویا قرا‌ٔت مشہورہ کی تفسیر ہے یا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قرا‌ٔت فاقطعوا ایمانھما یہ قرا‌ٔت بھی مشہور قرا‌ٔت میں لفظ ایدیھما کی مفسر ہے۔ اسی طرح حضرت جابرؓ کی قرا‌ٔت فان اللہ من بعد اکراھھن لھن غفور رحیم۔ تابعین سے بھی اسی قسم کی تفاسیر منقول ہیں مگر ان کا قرآن ہونا ہرگز ثابت نہیں ہوتا۔

الغرض ثبوت قرآنیۃ کے لئے رکن اہم صحت نقل ہے رسم مصحف کی موافقت اور ائمہ نحو کے اقوال سے مطابقت یہ گو ضروری سہی مگر پھر بھی بعد کا مرحلہ ہے۔ اس کے بعد اب اس کا فیصلہ خود فرما لیجئے کہ جس قرآن میں ائمہ نحو کی مخالفت سے قطع نظر کر کے ان کی موافقت حاصل کرنے کے لئے بھی کوئی ترمیم برداشت نہ کی گئی ہو کیا اس کے متعلق یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ اس میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ عہدِ عثمانی میں جس جماعت نے جمع قرآن کی خدمت انجام دی تھی وہ بڑے بڑے مشاہیر اہلِ لسان حضرات تھے اگر قرآنی کلمات میں کوئی سقم ہوتا یا اس میں دخل دینا جائز ہوتا تو وہ کیونکر ان خلاف قواعد امور کو باقی رہنے دیتے جن کو بظاہر عربیت کے خلاف سمجھا جا سکتا تھا۔

پھر کس قدر غضب ہے کہ جو چیز قرآن کی انتہائی حفاظت کی دلیل ہے آج اسی کو خصوم منہ بھر بھر کے تحریف کی دلیل بنا رہے ہیں یعنی بعض وہ مواضع جو بظاہر قواعد عربیت کے خلاف نظر آتے ہیں ان کو پیش کر کے

یہ نتیجہ نکالا جا رہا ہے کہ گویا قرآن میں ضرور تحریف ہوئی ہے ورنہ نظمِ قرآنی ایسی خلاف قاعدہ کیونکر ہو سکتی ہے۔ یہ اعتراض بھی ان دشمنانِ دین کا کچھ طبعزاد نہیں بلکہ آج سے بہت قبل علماء نے خود لکھکر اس کی پوری جوابدہی بھی کردی ہے جسے شوق ہو وہ تفسیر اتقان دیکھ لے۔ علامہ سیوطی نے اس پر مستقل ایک فصل قائم کی ہے اس کے مطالعہ کے بعد یہ ظاہر ہوگا کہ جن امور کو خلافِ قواعد کہا گیا تھا کیا وہ خلافِ قواعد ہیں۔ یا محض اپنے قصورِ نظر اور کم علمی کی وجہ سے ان کو خلاف ضابطہ کہہ دیا گیا ہے۔ میری غرض تو اس وقت صرف اس قدر ہے کہ اگر بالفرض والتقدیر یہ امور خلاف ضابطہ قرآن میں آچکے ہیں تو اس کی ذمہ داری صحابہ کرامؓ کے سر نہیں ہو سکتی کیونکہ ہمارے پاس اس بات کے لئے بہت روشن شہادتیں موجود ہیں کہ جو قرآن نازل ہوا تھا بلا تغیر وہی ہم تک پہنچا ہے اب اگر نازل شدہ قرآن ہی خلاف قاعدۂ عرب تھا تو امر دیگر ہے۔

صحیح بخاری کتاب التفسیر[1] میں ایک روایت ہے جس میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت عثمانؓ کا ایک مکالمہ درج ہے اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ قرآن کریم میں صحابہ کرام نے کہاں تک اپنی رائے کو دخل دیا ہوگا

قال ابن الزبیر قلت لعثمان بن عفان	ابن زبیرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عثمانؓ سے
والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا	کہا کہ آیۃ والذین یتوفون الخ جب دوسری آیت
قال قد نسختها الآیۃ الاخری فلم تکتبها	سے منسوخ ہو چکی ہے تو پھر آپ نے قرآن میں اُسے
وتدعها قال یا ابن اخی لا اغیر شیئا	کیوں رہنے دیا ہے۔ فرمایا کہ میں قرآن کی کوئی شے
منہ من مکانہ۔	بھی اپنی جگہ سے بدل نہیں سکتا۔

سبحان اللہ یہ وہی جواب ہے جو صاحبِ نبوت کی زبان سے نکلا تھا قل ما یکون لی ان ابدلہ من تلقاءِ نفسی۔ کافروں نے جب یہ درخواست پیش کی کہ آپ قرآن میں کچھ ترمیم فرما دیجئے تاکہ ہم لوگ اُسے مان سکیں تو جواب یہی ملا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان سے کہدو کہ بھلا مجھے قرآن کا اپنی جانب سے بدلنے کا کیا حق ہے جس کا کلام ہے وہی اسے بدل سکتا ہے۔ اسی طرح جب حضرت عثمانؓ سے سوال کیا گیا تو انھوں نے بھی یہی جواب

[1] ص ۶۵۰۔

دیا ہے کہ جب یہ آیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تلاوت ہوتی رہی ہے تو اگرچہ منسوخ بھی ہو مگر میں اپنی رائے سے اس کو کیسے قرآن سے خارج کر سکتا ہوں۔

ان واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ نے قرآن کے تحفظ میں رکن اہم اسی نقل صحیح کو سمجھا ہے اور قیاس آرائیوں کی کوئی پرواہ نہیں کی لہذا خصوم کا چند مزعوم خلاف قوانین عرب کلمات قرآن میں پیش کر کے یہ نتیجہ پیدا کر لینا کہ اس میں تحریف ہوگئی ہے قطعاً غلط ہے۔ بالفرض اگر انھیں تسلیم کیا جائے تو بالعکس یہی اس کی حفاظت نامہ کی دلیل ہوگی کہ جو اعتراضات عجم کے اذہان میں آسکتے تھے عرب کے رہنے والے صحابہ نے اس کے ازالہ کی بھی کوشش نہیں کی اور بلا لحاظ اعتراض وجواب جیسا قرآن صاحب نبوت سے ان کو پہنچا تھا اس کو من وعن امت کے سپرد کر دیا یا پھر یہ ماننا پڑیگا کہ درحقیقت قرآن میں کوئی چیز محل اعتراض ہی نہ تھی بلکہ یہ سب کچھ متبعین ہی کی خوش فہمی کا ثمرہ تھا۔

مگر یہ بات ایک منٹ کے لئے بھی تسلیم نہیں کی جا سکتی کہ جن مواضع کو خلاف قوانین عرب کہا جا رہا ہے وہ علی رؤس الاشہاد پڑھ پڑھ کر سنائے جا رہے تھے پھر قرآن کے دشمنوں میں سے کسی ایک نے یہ نہ کہا کہ جس قرآن کے معجز ہونے کا دعوی ہے وہ معجز تو درکنار صحیح بھی نہیں ہے۔ کیا کوئی تاریخی شہادت ایسی پیش کی جا سکتی ہے جس سے ایسے اعتراضات کا خصوم کی زبانی منقول ہونا ثابت ہو سکے۔ اہل علم جانتے ہیں کہ جن بے سروپا اور موضوع روایات سے اس جگہ کام لیا گیا ہے اس میں اگر اس قسم کی خرافات درج ہے تو وہ بھی مسلمانوں ہی کی زبانی ہے نہ کہ کسی دشمن کی۔ یہ کسقدر تعجب خیز بات ہے کہ محل اعتراض کو مسلمان تو کہتا پھرے اور دشمن زبان پر بھی نہ لائے۔ یہ خود اس بات کا ایک زبردست قرینہ ہے کہ جس نے بھی ان روایات کو وضع کیا ہے اس نے خود اپنی روایات موضوعہ میں دیدہ ودانستہ وضع پر ایک بڑا قرینہ چھوڑ دیا ہے۔ بہر حال ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اگر ائمہ نحو کے برخلاف کلمات کسی تحریف کی بدولت قرآن میں والعیاذ باللہ داخل بھی کر دیئے گئے تھے تو دور عثمان تک ان کو کوئی سمجھ نہ سکا اور آج ہندوستان کے گونگے اس کا ادراک کر سکتے ہیں۔ ہمارے نزدیک چونکہ یہ ایک تاریخی حقیقت کا انکار ہے اس لئے اس کی جوابدہی میں ہم وقت صرف کرنا اضاعت وقت کے مرادف ہے۔ لہذا لامحالہ یہ ماننا پڑیگا کہ اگر یہ امور خلاف قوانین عرب ہیں تو شروع سے ہیں۔ پھر اس کی ذمہ داری صحابہ کے سر نہیں عائد ہو سکتی۔ غالباً در پردہ ان معترضین کا مقصد یہی ہوگا کہ اس کی ذمہ داری کہیں اور رو پر عائد کی جائے۔ نعوذ باللہ۔ (باقی آئندہ)